اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۷، شمارہ۳، مسلسل شمارہ:۳۶۵، سال۲۰۲۲ء

اکیسویں صدی کی پاکستانی اردو نظم میں معروضی وواقعاتی شعور

راؤ محمد عمر
لیکچرر اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور
نمرہ حنیف
پی ایچ ڈی اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

SUBJECTIVE AND OBJECTIVE CONSCIOUSNESS IN LIST PAKISTANI URDU POEM

Rao Muhmmad Umar
Lecturer in Urdu
Govt. Islamia College, Civil Lines, Lahore
Nimra Haneef
PhD Scholar (Urdu)
GCU, Lahore

Abstract

The 21th century Urdu poem exhibits great consciousness about objectivity and factuality. It describes the socio-economic and political conditions of Pakistan highlighting major accidents and incidents took place in this era. Poems written in this era are not merely a piece of poetic utterances and expressions but also documented historical instruments which contain circumstantial and objective details. Besides portraying subjective themes, they provide analysis of the effects of inhuman objective situations. There are numerous poems which share and illustrate such themes as post-nine-eleven, the war on terror, terrorism, suicide attacks, bomb blasts, sectarianism, prevailing violent behaviors, class differences and natural disasters and catastrophes like earthquakes, floods and the corona pandemic.

Keywords:
Urdu poem, Post nine-eleven, War on Terror, Suicide, Natural, Natural disasters, Sectarianism, Terrorism.

اکیسویں صدی کی اردو نظم گہرے معروضی اور واقعاتی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ ''وجود جوہر پر مقدم ہے'' کی رو سے انسان جب اس جہانِ آب و گل میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو وہ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وجود کے خواص اور جوہر کا تعین خود کرتا ہے اور وہی کچھ بنتا ہے جس کا وہ ارادہ و انتخاب کرتا ہے۔ اپنی اوائلِ عمری سے لے کر لڑکپن تک، ذہنی و جسمانی نشو و نما کے عمل سے گزرتا، وہ کائنات اور اپنے ارد گرد کے ماحول اور اشیا سے متعلق شعور حاصل کرتا ہے۔ حصولِ شعور کا دار و مدار اس کے حواسِ خمسہ پر ہوتا ہے۔ حواسِ خمسہ کے بل بوتے پر وہ مادے کی مختلف حالتوں اور خواص کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس مشاہدے سے حاصل ہونے والا شعور دراصل دوسری چیزوں کا شعور ہوتا ہے۔ یہ شعور یا علم، عالم اور معلوم، دیکھنے والے (Observer) اور دیکھی گئی چیز (Observed) کے تعلق سے حاصل ہوتا ہے۔ وجود انھی اشیا سے حاصل شدہ شعور اور علم کی نسبت اور تقابل سے اپنے ہونے اور اپنی ہستی کی تفہیم کرتا ہے۔ زبان و بیان، اظہار، ابتدائی تعلیم و تربیت، مشاہدۂ فطرت اور نظریات کے حصول کا عمل فرد کے انھی حواسِ خمسہ پر انحصار کرتا ہے۔ انھی حواس کی بہ دولت وہ اس کائنات اور دوسرے لوگوں سے جڑا ہوتا ہے۔ ان کے بغیر وہ اپنی ذات سے بھی حقیقی آشنائی حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی کائنات سے۔ اس امر کی وضاحت فلسفے کے اس تصوراتی و تخیلاتی سوال سے کی جا سکتی ہے کہ کیا کوئی ایسا شخص جو عدم میں ظہور پائے، اپنے ہونے کا حقیقی عرفان حاصل کر سکتا ہے؟ جہاں نہ تو اس کے پاس حواسِ خمسہ پرکھنے والی کوئی چیز موجود ہو اور نہ ضروریاتِ زندگی کا احساس۔ یقیناً فرد ایسے ماحول میں اپنے ہونے کا حقیقی احساس حاصل نہیں کر سکتا۔ بہ قول افتخار بیگ (پ:۱۹۵۸ء):

> ''وجود جہد و عمل پر اساس کرتا ہے اور جہد و عمل کے لیے احساسات اور جذبے ایک لازمی عنصر ہیں کیوں کہ فرد داخلی تجربے کے توسط سے اپنے 'من' کے جوش و جذبے سے آشنا ہوتا ہے۔ احساس اور جذبہ دوہری کیفیت کا حامل ہوا کرتا ہے یعنی ایک موضوعی سطح اور دوسری معروضی سطح۔ احساسات بیک وقت جذبِ دروں سے بھی علاقہ رکھتے ہیں اور دنیا سے بھی۔ یہ موجود کے داخلی تجربے کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ معاملہ اگر محض جسم کا ہو تو فرد محض ایک شاہد ٹھہرتا ہے یعنی فرد ایک علیحدہ شے اور دنیا ایک علیحدہ شے اور فرد دنیا کو دور سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے مگر فرد تو اپنی جذبی کیفیات کے حوالے سے

دنیااور دنیاکے واقعات میں الجھا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فرد جسم وجذبے کا مرقع ہے اور دنیا سے اس کا واسطہ بہ طور ایک اکائی کے ہوتا ہے۔ جسم وجذبے کی یہ اکائی، احساس اور جذبے کی جسم کے ساتھ جڑت کی بنا پر قائم ہے مثلاً چھونے کا احساس، حسِ لامسہ کا نتیجہ ہے مگر جب تک جسم کا کوئی حصہ کسی شے کو چھونے کے عمل سے نہ گزرے، حسِ لامسہ بیدار نہیں ہوتی اور جب تک حسِ لامسہ نہ ہو گی، چھونے کا عمل بے معنی ہو گا۔ اسی طرح جب تک احساس نہ ہو گا جذبے مہمیز نہ ہوں گے۔ یہی جسم وجذبے کی وحدت بالآخر وجود پر منتج ہوتی ہے۔"(۱)

انسانی وجود اب تک کی معلوم اور دریافت شدہ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور پیچیدہ ترین ہستی ہے۔ یہ اپنی ساخت اور جسمانی خواص کے اعتبار سے واقعی دنیا کی افضل ترین مخلوق ہے جو اپنے شعور و ادراک، احساسات و جذبات اور صنعت و تخلیق کی قدرت اور محاسن کی وجہ سے اس اشرفیت اور فضیلت کی حامل ہے۔ جدید فلاسفہ وجود کے کسی پہلے سے متعین شدہ جوہر اور خواص کی نفی کرتے ہیں تو اس سے مراد قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی وجود کے ان عمومی اور بشری وانسانی خواص کی نفی کرتے ہیں بل کہ وہ ان خواص (جذبات واحساسات، شعور وادراک، آزادیِ انتخاب اور قدرت) کے بل پر لیے جانے والے غلط فیصلوں (انتخاب) اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان تصورات وروایات کی نفی کرتے ہیں، جن جبریہ نظریات کے سبب فرد ان اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتا ہے۔ سو دنیا کی اس ترقی وارتقا کے ساتھ ساتھ دنیا کے ان خرابوں کے پیچھے بھی انسان ہی کا ہاتھ کارفرما ہے اور جب تک وہ اپنی اس آزادی کو تسلیم نہیں کر لیتا، تب تک اس جہانِ خراب میں بہتری کی امید نہیں کی جاسکتی کیوں کہ جین پال سارتر (۱۹۰۵۔۱۹۸۰ء Jean-Paul Sartre) کے نزدیک فرد کی آزادی کے ساتھ، ذمہ داری کا عنصر بھی جڑا ہوا ہے۔ وہ جب اپنے لیے انتخاب کر رہا ہوتا ہے تو وہ سب کے لیے انتخاب کر رہا ہوتا ہے۔ سارتر کے ان خیالات کے تناظر میں بیسویں صدی عیسوی میں ہونے والی ہول ناک عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں اور ہلاکتوں کے اعداد وشمار پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چند اربابِ اختیار اور اداروں کے غلط فیصلوں کے نتیجے میں پورا عہد ذہنی وجذباتی سطح پر بری طرح

مجروح ہو کر رہ گیا۔ ان جنگوں کے یہ اثرات وقتی اور لمحاتی نوعیت کے نہیں تھے بل کہ ان کے اثرات دورِ حاضر کی معاشی، سیاسی اور سفارتی پالیسیوں میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

انسان کی داخلی سطح اور موضوعیت ہر لحظہ، ہر لمحہ معروضیت اور خارجیت کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ وہ خارج کے واقعات و حادثات کا اثر قبول کرتا ہے۔ اس کی داخلیت نادیدہ دھاگوں کے ساتھ ہمیشہ معروض اور گرد و پیش کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی احساساتی سطح پر لوگوں اور ارد گرد کے ماحول اور اشیا سے مانوس ہوتا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا شعور بھی دراصل دوسری اشیا یعنی مادی خواص کا شعور ہوتا ہے۔ وہ اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے مادے اور ٹھوس اشیا کے جن خواص کا ادراک حاصل کرتا ہے وہ چاہے اسی کی طرح کے دوسرے شعوری اور داخلی دنیا کے حامل انسان ہی کیوں نہ ہوں، اس کے لیے وہ معروض اور خارج کا حصہ ہی ہیں۔ لہٰذا اپنی ابتدائی شعوری حالت سے لے کر ممکنہ شعوری حالت تک وہ مائیکرو (Micro) اور میکرو (Macro) سطح پر معروض سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دور، عہد اور عصر کا اندازہ انھی چیزوں سے لگاتا ہے۔ سو اپنی اسی مانوس ہونے کی صفت کے سبب وہ اپنے معروضی حالات کا اثر قبول کرتا ہے اور ان میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات اس کی فکری، شعوری، داخلی اور احساساتی دنیا میں ہیجان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے معروضی حالات کے بارے میں بات کی جائے تو نائن الیون کے حادثے کو موجودہ صدی کے اعتبار سے رجحان ساز سانحہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سانحے کے اثرات امریکا سمیت پوری دنیا کے دیگر ممالک میں بسنے والے افراد کے ہاں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وار آن ٹیرر (War on Terror) کے نام پر دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والی کارروائیوں نے ان خطوں اور بالخصوص ان ممالک کے باسیوں کی ذہنی و جذباتی سطح کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اسی لیے نائن الیون کے اثرات دنیا کے ہر خطے اور ہر زبان میں لکھے جانے والے ادب میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ نائن الیون کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے دانیال طریر (۱۹۸۰۔۲۰۱۵ء) لکھتے ہیں:

> ''...نائن الیون نے ''دہشت گردی'' کے حوالے سے ایسا کلامیہ تشکیل دیا ہے جس کا مقصد ایک مخصوص آئیڈیالوجی کا نفاذ ہے۔ جو بہ ذاتِ خود ایک ''وحشی ریاست'' کا

مظہر بھی ہے اور اس کے لیے مزید طاقت کے حصول کا ذریعہ بھی، اس لیے بہت سے کلامیوں کو عدم رائج کرنے کی کوشش ہوئی ہے اور ان کے بدلے نئے کلامیے رائج کیے گئے ہیں۔ اس کے لیے ہر ممکنہ ذریعے کو استعمال کیا گیا ہے اور اس طرح انسانی فکر کو تبدیل کر کے اس کی نئی تشکیل کے ذریعے اسے گرفت میں لینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور اسے اپنی من چاہی حدود تک محدود کر دیا گیا ہے۔ عالمی سیاسی بساط پر نائن الیون کے بعد وہ چالیں چلی گئی ہیں کہ پیادے وزیر اور وزیر پیادے میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تمام مہروں کی حیثیت اور کارکردگی کا دائرہ کار بدل گیا ہے اور دنیا انتہائی غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہو گئی ہے۔ سیاسی طور پر مستحکم معاشرے عدم استحکام کا شکار ہوئے ہیں جب کہ غیر مستحکم معاشرے مزید ابتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ معاشی طور پر حالات بد سے بد تر ہونے لگے ہیں اور غریب ریاستوں میں جہالت اور بھوک میں اضافہ ہوا ہے، جس نے جرائم کو ہوا دی ہے اور لاء اینڈ آرڈر کے شدید مسائل پیدا ہوئے ہیں۔"(۲)

بین الاقوامی سطح پر ہونے والے نائن الیون کے انھی اثرات کو شاہدہ حسن (پ:۱۹۵۳ء) اپنی نظم "زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے" میں یوں بیان کرتی ہیں:

"محاصرہ بڑھ رہا ہے پیہم / نجف میں، بصرہ میں / اور بغداد کی فصیلوں میں اب دراڑیں پڑی ہوئی ہیں / زمانہ طاقت کے ناخداؤں کے / اک اشارے پہ چل رہا ہے / نئی تباہی کے رخ پہ / کروٹ بدل رہا ہے / خدا کے لہجے میں بات کرتے / یہ چند انساں / زمیں کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں / مفاد کی اور غرض کی دنیا / انوکھے انصاف پر مصر ہے / وہ اس زمیں کے چھپے خزانوں پہ / اپنے سانپوں کی پہرے داری کی منتظر ہے / ادھر زمینِ عراق / کہنہ روایتوں کے مہیب صحرا میں / ان گنت بے نشان قبروں کے / سلسلوں کو بڑھا رہی ہے / ادھر وہ قوت، سپاہ کثرت / نئے عزائم کی داستانیں سنا رہی ہے / تحیر آمیز طاقتوں کے ہزار جلوے دکھا دکھا کر / دلوں میں بارود کی سرنگیں بچھا رہی ہے / نئی صدی کے بدن میں سرطان پل رہا ہے / زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے"(۳)

نائن الیون کے سانحے نے عالمی سیاست اور موجودہ عہد پر ان مٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ اس سانحے کے بعد عالمی منظر نامے پر خوف، دہشت اور پریشانی کی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ عراق، افغانستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اثرات اس زمانی حدود میں بھی بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جنگی کارروائیوں کی وجہ سے ہونے والے جانی و مالی نقصان نے ان ممالک کے افراد کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اَن دیکھے، ماورائی نظریاتی دشمنوں کے خلاف اس جنگ میں دو طرفہ نقصان انسانیت کا ہی ہو رہا ہے۔ بے جسم، بے جان نظریات کی لڑائی میں بہنے والا سرخ رنگ لہو انسانوں کا ہی ہے۔ نظریات اور طاقت کے دکھاوے کی اس لڑائی میں انسانیت پامال ہو رہی ہے۔ ثمینہ تبسم (پ: ۱۹۴۷ء) اپنی نظم '' ڈونلڈ ٹرمپ سینڈروم آؤٹ بریک'' میں اسی المیے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''۔۔۔ میں اس دنیا کی شہ رگ پر کھڑی/انسان اور انسانیت کی فکر میں گھلتی/ہر اک بچے، بڑے بوڑھے سے کہتی ہوں/تمھارے اپنے گھر، کوچے محلے میں/محبت اور رواداری کو نفرت کھا رہی ہے ہر گھڑی، پیہم/جو سب کو مار ڈالے گی/تم اب دنیا میں/طاقت/اور دولت/اور سیاست/اور مذہب کا نیا اک کھیل دیکھو گے/یہ دنیا چند برسوں میں مٹے گی/اور پھر سے ارتقائے آدمی ہو گا/تمھیں انسان یا ڈونلڈ بننا ہے!!''(۴)

نائن الیون اور اس کے اثرات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بھی اکیسویں صدی کے مجموعی حالات فرد کی مشکلات میں مزید اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ صارفی معاشروں کے قیام اور عالمی منڈی کے تصور سے ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک اور غریب طبقے کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر (New World Order) اور یک قطبی، سماجی اور معاشی نظام نے عالمی امن و امان کی صورت حال کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ سفارتی سطح پر ابھرتی قوتیں نئے جوڑ توڑ اور سفارتی تعلقات کو تشکیل دے رہی ہیں۔ ذہنی سطح پر ممالک تیسری عالمی جنگ کے لیے حمایتی تلاش کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ایشیا میں چاہ بہار اور گوادر پورٹ کے معاملے پر کئی ممالک کے مفادات ایک دوسرے سے جڑ رہے ہیں۔ نئے ملکی گروہ قیام میں آ رہے ہیں اور ابھرتی طاقتیں اپنا آپ منوانے کے لیے بے چین ہیں۔ لہٰذا اس وسیع سطحی

معروضی اتار چڑھاؤ اور غیر یقینی صورت حال میں فرد کو خوف، دہشت اور بے چینی جیسے احساسات کا سامنا ہے۔ اس تمام صورتِ حال کے اثرات جدید ادب میں مرکزی اہمیت اختیار کر چکے ہیں اور یہ عین فطری عمل ہے کیوں کہ فرد بہ طور ادیب اپنے محسوسات، جذبات اور خیالات کو ادب کا حصہ بناتا ہے۔ انھی خیالات کو تقویت بخشتی اور موجودہ استعماری عہد کے حقیقی گھناؤنے چہرے کو آشکار کرتی، وحید احمد (پ: ۱۹۵۹ء) کی نظم ''جگ آشوب'' ملاحظہ ہو:

> ''ہمارا عہد کیا ہے، درد کی خوانچہ فروشی ہے/زمیں ہے یا کمیں ہے؟/جنس کے بیوپار کی منڈی ہے/جذبوں کی تجارت کی تماشا گاہ ہے/حرمت کی ارزانی کا اڈا ہے/گلوبل گاؤں تو نیلام گاہِ وضع داری ہے/یہ چپٹا گیند بس اقدار کی سوداگری کا بوجھ اٹھائے گھومتا ہے/کارپردازانِ استہزا/فضا میں ایٹمی میزائلوں کے ساتھ لفظوں کا تمسخر اڑاتے ہیں/یہاں پر کاروبارِ زندگی اب درحقیقت کاروبارِ زندگی ہے''(۵)

اکیسویں صدی میں ان اثرات کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ادب میں گہرا عوامی و سماجی شعور دکھائی دیتا ہے۔ نظم کے موضوعات، عنوانات، لفاظی، استعارات، تشبیہات اور تراکیب پر ان معروضی حالات کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ خوف، دکھ، مایوسی، بے چینی، دہشت، موت، وبا، ایٹمی ہتھیار، میزائل، بم، دھواں، بارود، جنگ، طیارے، خون، آنسو، راکھ، مٹی، یرغمال، اجتماعی قبریں، بے یقینی، قیامت، تباہی، تاریکی، امن وامان، درندگی، بھوک، پیاس، غربت اور لاش جسے الفاظ اور استعاروں کے استعمال کا رجحان نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر اس دور کی نظموں کا بڑا حصہ وجودی کرب میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے اور عصرِ حاضر کے نظم نگاروں نے اس کمال مہارت سے فرد کی پوری ذات کو اپنی نظموں میں ڈھالا ہے کہ بین السطور فرد کی پوری ذات کھل کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں سرد جنگ کے خاتمے پر دنیا نے جس امن کے خواب دیکھے تھے وہ خواب اکیسویں صدی کے ایک برس بعد ہی ہونے والے نائن الیون کے سانحے کے ساتھ چکنا چور ہو گئے۔ نائن الیون کے اس حادثے میں ہلاک ہونے والے سینکڑوں افراد کے خون بہا اور بدلے نے کئی ملکوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ قتل و غارت کی اس سرخ آندھی کی لپیٹ میں جو بھی آیا، فنا ہو کر رہ

گیا۔ عراق میں ۲۰۰۳ء سے شروع ہونے والی جنگ میں، ہنوز اس زمانی دورانیے میں بھی قتل و بربریت کا بازار گرم ہے۔ سلمیٰ ریاض اپنی نظم ''عراق کی نذر'' میں اس المیے کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''یہ منظر تو مجھے دیکھا سا لگتا ہے / وہی بغداد کی گلیاں / وہی اترے ہوئے چہرے / وہی آہ و فغاں کرتے ہوئے دن / اور وہی تاریک سی راتیں / وہی دشمن وہی گھاتیں / یہ منظر تو مجھے دیکھا سا لگتا ہے / وہی لٹتے ہوئے، جلتے ہوئے خیمے / وہی شامِ غریباں / اور سروں سے چادریں کھینچی ہوئی / بہنوں کی، ماؤں کی / وہی زنداں، وہی آنسو / یہ منظر تو مجھے دیکھا سا لگتا ہے / وہی پیاسے گلے کٹنے کا منظر / اور بکھرتے چار سُو لاشے / شہیدوں کے لہو میں ہاتھ رنگنے کا وہی منظر / وہی اجڑی ہوئی ماؤں کی گودیں / اور وہی جور و ستم کا دور دورہ ہے / یہ منظر تو مجھے دیکھا سا لگتا ہے''(۶)

عراق کا دارالحکومت بغداد مسلم معاشرت، تہذیب و تمدن اور ان کے تابناک ماضی کا نشان ہے۔ بغداد اس دور میں بھی علم و فن، زبان و ادب اور انسانی سربلندی کا امین تھا کہ جب یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دورِ حاضر کی بڑی بڑی طاقتوں کا نام تک بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ اپنی روشن تاریخ اور مسلم معاشرت کا مرکز اور امین ہونے کی وجہ سے مسلمان ممالک اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں کا سب سے زیادہ اثر عراق کے دارالحکومت بغداد میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی لیے پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کی ذہنی اور جذباتی سطح پر بھی اس جنگ سے ہونے والے نقصانات کے اثرات شدید ہیں۔ سوا کیسویں صدی میں لکھی جانے والی نظموں میں عراق جنگ سے متعلق غم و غصے کے ملے جلے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ معین نظامی (پ: ۱۹۶۵ء) کے ہاں یہ اظہار ان لفظوں میں ہوا ہے:

''ابد تک شہرہ آفاق ہوں اور خود پہ نازاں ہوں / عروسِ قریہ ہائے امن ہوں / ناپاک غارت گر / مری حرمت پہ حملے کر رہے ہیں / اور مری چادر کو تاتاری درندے / تیروں اور نیزوں سے چھلنی کرتے جاتے ہیں / میں مستعصم ہوں''(۷)

معین نظامی کی یہ نظم '' مجھے بغداد کہتے ہیں'' ایک اثر انگیز نظم ہے جس میں عراق میں ہونے والے ظلم و ستم کی داستان کو بڑے دل سوز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عالمی منظر نامے

پر عراق سمیت کشمیر، فلسطین، افغانستان اور بوسنیا بھی تشدد اور ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان دیسوں میں بسنے والے افراد کا خون چند ٹکوں کی گولی کے برابر ہے۔ ان مظلوموں کے حق میں بہتری کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ انسانی حقوق کی محافظ تنظیمیں اس ضمن میں اپنی زبان تالو سے لگائے بیٹھی ہیں جب کہ اقوام متحدہ کی زبان پر بھی تالے لگے ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی کی اس ارزانی اور تحقیر کو بیان کرتی ضیاء الحسن (پ: ۱۹۶۴ء) کی یہ نظم ''اتفاق سے ملی ہوئی شے'' قاری کو عہدِ حاضر میں ہونے والی قتل وغارت اور انسانی جان کی بے وقعتی اور کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے:

> ''جب ہمیں کوئی چیز اتفاق سے مل جاتی ہے/تو ہم اس کی قدر نہیں کرتے/کسی کونے کُھدرے میں ڈال دیتے ہیں/کسی طاق پر رکھ کر بھول جاتے ہیں/یا بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں/زندگی بھی ہمیں اتفاق سے ملی ہے/کبھی ہم اسے رحمِ مادر میں رکھ کر بھول جاتے ہیں/بوسنیا اور کشمیر میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں/روانڈا میں ہیضے کے حوالے کر دیتے ہیں/زندگی کے خلاف ہم نے/نیو کلیائی ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں/نسلی، لسانی اور جغرافیائی تضادات گھڑ لیے ہیں/کہتے ہیں یہ دنیا بھی/کسی حادثے کے نتیجے میں اتفاقاً وجود میں آئی ہے''(۸)

بے حسی کے اس دور میں انسانی جان کی قیمت اور اہمیت عالمی برادری کی نظر میں اس ملک کی قدر و منزلت کے اعتبار سے طے پاتی ہے۔ عالمی برادری مظلوم اور ظالم کے حق میں فیصلہ دینے سے پہلے ان کے سٹیٹس (Status) کو مد نظر رکھتی ہے۔ اتفاقاً معرضِ وجود میں آنے والی اس دنیا میں، زندگی کی قیمت بھی راہ چلتے اتفاقاً ملی ہوئی بے کار چیز جتنی ہے۔ اسی لیے اس حقیر مخلوق کے سروں سے آسمان اور پیروں تلے سے زمین کھینچ لینا طاقت ور کا شیوہ ہے۔ یہ جدید دور میں دکھاوے کا نیا طریقہ ہے۔ طاقت ور، کم زور پر حملہ کر کے دوسرے ممالک کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے کہ دوسرے ممالک پر اس کی دھاک بیٹھ جائے اور وہ اس خوف و سراسیمگی کی فضا میں فاتحانہ قہقہہ لگا سکے۔ سعید الدین کی نظم ''مالِ غنیمت'' اسی جھوٹے تفاخر اور دکھاوے کو اس انداز میں بیان کرتی ہے:

''پہلے یہ دشمن سے چھینا ہوا ایک ٹینک تھا/ جسے ہم نے قومی تفاخر کے اظہار کے لیے/شہر کے ایک نمایاں چوک میں لا کھڑا کیا تھا/ لیکن جب ہمارے قومی تفاخر کو/زنگ کھا گیا/تو اس ٹینک کو ہم بھول گئے/اسے ایک فلائی اوور کے نیچے چھپا دیا گیا/اسے چرس کے سوٹے لگانے/اور رفع حاجت کے لیے استعمال کیا جانے لگا/ پھر اس میں یکایک حرکت ہوئی/اور یہ ہماری تاریخ کی شاہراہ پر دوڑتا ہوا/دور تک نکل گیا/ہم اسے فلائی اوور کے نیچے چھپانے میں بری/طرح ناکام ہوئے/اس کی نال/بے قراری سے دائیں بائیں گھومتی/اور کبھی یہ ایک ہی جگہ پر کھڑا غراتا رہتا/ پینسٹھ کی جنگ نے ہمیں/دشمن کے کئی ٹینک/اور لڑاکا طیارے دیے/جو آج بھی کسی فلائی اوور کے نیچے/یا کسی متروکہ فوجی چھاؤنی میں/گل سڑ رہے ہوں گے/ جسے ہم کسی بھی فوجی وردی/یا اپنے احساس تفاخر سے ڈھانپنے میں/ بری طرح ناکام ہوئے ہیں''(۹)

جھوٹے تفاخر اور طاقت کی ہوس انسان کو ظالم و متکبر بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے مان اور دو بول تعریف کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتا ہے۔ ''مالِ غنیمت'' (درج بالا نظم) میں بھی اسی تلخ سچائی کا احاطہ کیا گیا ہے کہ وسیع پیمانے پر ہونے والے قتل و غارت کا مقصد چند لوگوں کی جھوٹی انا اور مان کے علاوہ بھلا اور کیا ہے؟ یا یہ فقط مالِ غنیمت اور مفتوحہ ملکوں کے وسائل پر قابض ہونے کے جتن ہیں۔ دونوں صورتوں میں انسانی جان کی یہ ارزانی اور بے وقعتی ایک افسوس ناک بات ہے۔ وہ جو اپنے رتبے میں مہر و ماہ سے بھی زیادہ اہم ہے اور جو ایک محدود وقت کے لیے یہاں ہے، جو حرفِ مکرر بھی نہیں، اس کے ساتھ یہ حقارت آمیز برتاؤ ایک ذی شعور فرد کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

شاعر سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں، لوگوں کو درپیش مسائل اور کٹھنائیوں سے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہتا کہ اسے کہنا ہوتا ہے بل کہ وہ اس لیے کہتا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنی حساس طبیعت اور فطرت کے سبب بہترین مشاہد ہوتا ہے۔ اس کی حساس داخلی دنیا چھوٹی چھوٹی چیزوں اور حادثات کا بھی اثر قبول کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں

معاشرے کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر وجود کو درپیش کلیدی اور وجودی مسائل کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا آئنہ دار ہوتا ہے اور آئنے کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے سامنے کھڑی چیز کا من و عن عکس اور ہو بہ ہو تصویر دکھاتا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے ہاں فقط رجائی خیالات اور مضامین دیکھنے کو ملیں۔ اگر اس کے ہاں قنوطی خیالات اور دکھ والم کا اظہار و بیان دیکھنے کو ملتا ہے تو یہ عین فطری رویہ ہے، کیوں کہ بہ طور عکاس وہ معاشرے کا وہی عکس دکھا رہا ہوتا ہے جو اس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں موجود تنوع دراصل حقیقی زندگی کے وہ مختلف شیڈز اور رنگ ہیں جو اس کی محسوسات کا حصہ بنتے ہیں اور اس کے احساساتی نظام اور جذباتی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عصری و معروضی حالات کے زیرِ اثر، فرد کے احساساتی و جذباتی نظام میں آنے والے اتار چڑھاؤ کے عمل کو واضح کرتی نصیر احمد ناصر (پ:۱۹۵۴ء) کی نظم ''دکھ گوتم سے بڑا ہے'' ملاحظہ ہو:

''۔۔۔ گوتم نے غزہ نہیں دیکھا/وہ عراق، افغانستان اور شام نہیں گیا/اُس نے تو کراچی اور کوئٹہ بھی نہیں دیکھے/بوری بند لاشیں/اور خود کش دھماکوں میں اُڑتے ہوئے/انسانی اعضا نہیں دیکھے/بحرِ متوسط کے ساحل پر/اوندھے پڑے ہوئے ایلان کردی/اور دریائے ناف کے کنارے/کیچڑ میں لت پت شوحیات کو نہیں دیکھا/افریقہ میں دودھ سے عاری/ڈھلکی ہوئی سیاہ رنگ چھاتیاں/اور مرتے ہوئے آبنوسی ڈھانچے نہیں دیکھے/گوتم نے عظیم جنگیں/اور آبدوزوں میں مرنے والوں کی آبی قبریں نہیں دیکھیں۔۔۔''(۱۰)

''دکھ گوتم سے بڑا ہے'' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم میں گہرا عصری و معروضی شعور اور فکر دیکھنے کو ملتی ہے۔ گوتم کہ جس نے دنیا کے دکھوں اور انسان کو درپیش مصائب اور مسائل سے بددل ہو کر دنیاداری ترک کر دی اور راہبانہ طرزِ زندگی کو اپناتے ہوئے حقیقی خوشی اور سچ کی تلاش میں ویرانے کا رخ کیا۔ گوتم کے نظریات ماورائیت اور رجائیت کا پرچار کرتے ہیں۔ لہٰذا اس نظم میں شاعر دورِ حاضر کے انسان دشمن ضابطوں اور اخلاقیات پر طنز کرتے ہوئے آج کے فرد کو درپیش مسائل اور دنیا کی موجودہ ابتر صورت حال کا بیان انتہائی خوب صورت اور سلیس انداز میں کرتا ہے۔ کہ گوتم نے آج کی موجودہ ابتر

صورت حال دیکھی ہوتی تو شاید وہ ویرانوں میں بھی سکون سے زندگی نہ گزار پاتا اور ان مصائب اور غموں سے فرار کے راستے تلاش کرتا۔ وہ جان لیتا کہ ابدی سکون کا حصول ناممکن ہے اور فرد کو اسی دنیاے خراب میں اپنے غموں کے ساتھ زندگی کی گنتی پورا کرنی ہوگی۔ وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے ان مصائب اور مسائل سے چشم پوشی کر سکتا ہے اور فرار کی راہ تلاش کر سکتا ہے مگر وہ حقیقت کو بدلنے سے قاصر ہے۔

اس عالمی منظر نامے سے ہٹ کر پاکستان کے سماجی و عصری حالات کا ذکر کیا جائے تو اسے بھی دیگر ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کی طرح غربت، معاشی و سیاسی بحرانوں اور دہشت گردی جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ اکیسویں صدی فرد کی امیدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے اور یہاں کے حالات مسلسل ابتری کی طرف مائل ہیں۔ اس جدید دور میں بھی یہاں کے تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی عدم دست یابی سمیت ناخواندگی، غربت، فرقہ پرستی و شدت پسندی اور معاشی بحران جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ سخت مذہبی و روایاتی اخلاقیات کے سبب یہاں کے عوام اپنی آزادیِ انتخاب اور چناؤ کے حق سے محروم ہیں۔ جہالت کی وجہ سے یہاں کی مجموعی فضا تنگ نظری، شدت پسندی اور معاشی پسماندگی کا شکار ہے۔ رہی سہی کسر پچھلی چند دہائیوں سے ہونے والی دہشت گردی اور کرونا وبا نے پوری کر دی ہے جس کے سبب یہاں بسنے والوں کے ہاں خوف، دہشت، بے چینی، الجھن اور کرب جیسی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان سب عوامل نے مل کر پاکستانی معاشروں میں بسنے والے افراد کی نفسیاتی و احساساتی سطح کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کی نظم میں پاکستان کے عصری حالات کی عکاسی کرتے ہوئے شعرا کے ہاں دہشت گردی، خودکش دھماکے، چیتھڑے اڑنا، مسخ لاشیں، بے کفن اور موت جیسے الفاظ کا استعمال بہ کثرت دیکھنے کو ملتا ہے۔

اکیسویں صدی میں پاکستان کو درپیش مسائل میں سب سے سنگین مسئلہ دہشت گردی ہے۔ دہشت گردی کے واقعات میں قوم، مذہب اور عمر کسی چیز کا لحاظ نہ رکھا گیا اور بلا تفریق لوگوں کو بموں سے اڑایا جا رہا ہے۔ نہ تو ان شر پسندوں کے شر سے کوئی بازار اور شہر محفوظ رہا ہے اور نہ ہی انھوں نے کسی مذہبی مقام اور عبادت گاہ کا تقدس ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان درندہ صفت

دوپایوں کو کسی چیز سے کوئی انسیت اور نسبت نہیں ہے۔اس دہشت گردی میں رائفلوں، راکٹ لانچروں اور نصب بموں کے ساتھ خود سوزی جیسے دہشت گردی کے سب سے زیادہ سنگین اور خطرناک حربے استعمال کیے جا رہے ہیں، جس سے زیادہ سے زیادہ جانی و مالی نقصان کیا جا سکتا ہے اور جسے روکنا یا ناکام بنانا تقریباً ناممکن ہے۔اسی لیے اس عہد اور اس فضا میں سانس لینے والے افراد کے ہاں خوف اور بے یقینی کی صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ حفیظ تبسم (پ:۱۹۹۰ء) کی یہ نظم ''گناہ گار شاعر کی بے گناہ نظمیں'' انھی حالات میں رہنے والوں کی ذہنی و نفسیاتی حالت کو بیان کرتے ہوئے، حالات کی ستم ظریفی کی منظر کشی کر رہی ہے، جس میں افراد ہجوم والی جگہوں پر جانے سے خوف محسوس کرتے ہیں:

> ''کل میری دو نظمیں بازار گئیں/(جو جڑواں بہنیں تھیں)/مگر واپس نہیں لوٹیں/ان دنوں کرفیو کے باعث/کھلے عام گھومنا ممنوع تھا/لیکن میں نے دن کی رفتار سے تیز بھاگتے ہوئے/شہر کا چکر کاٹا/رات کے سائے کے ڈر سے/مسجدوں میں اعلان کروائے گئے/مگر دہشت کے بستر میں دبکے لوگ/کچھ نہیں جانتے/کس کی پھٹی ایڑیوں سے رستا خون/لکیریں کھینچ رہا ہے/آخر افسردگی سے دیوار میں لگا ٹی وی آن کیا/''سپر مارکیٹ دھماکے سے اڑا دی گئی''/میں بھاگتا جائے وقوعہ پہنچا مگر/پانی سے موت کے نشان/گٹر میں بہائے جا چکے تھے/اب بے یقینی کے سگریٹ پھونکتا/قبروں کے پاس بیٹھا ہوں/جہاں بم دھماکے میں مری روحیں دفن ہیں/مگر میری نظموں کی قبر کون سی ہے/کہ مٹی کے چہرے سے پہچان ممکن نہیں/اور میں/مرنے سے پہلے کتبہ لگانا چاہتا ہوں/''یہاں گنہگار شاعر کی بے گناہ نظمیں دفن ہیں''(۱۱)

بین الاقوامی سطح پر بد تر سے بد ترین ہوتے ان حالات سے ہٹ کر پاکستان کے ملکی حالات بھی خطرناک حد تک گراوٹ کا شکار نظر آتے ہیں۔امن و امان کی انتہائی مخدوش صورت حال کے ساتھ ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بحرانوں کی زد میں مزید ابتری کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ دہشت گردی کے نتیجے میں ہونے والے جانی و مالی نقصان کے نتیجے میں یہاں کے بسنے والے افراد مایوسی اور دکھ کا شکار ہیں۔امن و امان کی اس بد سے بد تر ہوتی صورتِ حال اور فرد پر ان حالات کے جبر کا اظہار

شاہد اشرف (پ:۱۹۶۶ء) کی نظم " چشمہ " میں دیکھنے کو ملتا ہے:

> " یہ کیسا سانحہ ہے، جابہ جا اعضا پڑے ہیں / جسم بے ترتیب، خوں سے تربتر بکھرے ہوئے ہیں / دھول میں گڑیا اٹی ہے / چند سکے ننھے ہاتھوں میں دبے ہیں / پاس ہی اک شال پر کاڑھے ہوئے پھولوں کی / راکھ اڑنے لگی ہے / ایک گجرا بھی سلگتا ہے / رنگ، خوش بو اور خد و خال کا ملبہ پڑا ہے / بے خبر لوگوں کے سپنے خون سے بھیگے ہوئے ہیں / مرنے والوں کو پتا کیسے چلے کس جرم میں مارے گئے ہیں / مارنے والوں کو کب معلوم ہے / اس سانحے میں کون مارا جا چکا ہے؟ / پائے قاتل کے نشان سرحد سے آگے دوسری جانب دکھائی دے رہے ہیں / محاذِ جنگ کے دونوں طرف ہم ہی کھڑے ہیں / اور مرنے مارنے کا فائدہ دشمن اٹھاتا ہے / ہمارے ہاتھ، ٹانگیں اور بازو کٹ کر گرتے ہیں تو / اُن کو جوڑ کر پُتلے بناتا ہے / تماشا بھی دکھاتا ہے / اگر ناراض نسلوں کا کوئی ردّ عمل ہے؟ / تو سبب یہ ہے کہ عصرِ کربلا سے آج تک دریا پہ پہرے ہیں / ہمارے ہونٹ پانی کو ترستے ہیں / یہ کیسا سانحہ ہے، ہر کوئی حیرت زدہ ہے / جہاں پر بم پھٹا تھا، اب وہاں سے ایک چشمہ / پھوٹ نکلا ہے " (۱۲)

ایسی ناگہانی اور دردناک موت کا تصور ہی انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے جس سے آدمی کی لاش بھی قابلِ شناخت نہ رہے اور اس کے جسم کے اعضا اس انداز میں چیتھڑے ہو کر بکھر جائیں کہ ان کو جمع کرنا بھی مشکل ہو جائے گزشتہ برسوں میں ٹارگٹ کلنگ (Target Killing) کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا ہے، جس کی ممکنہ وجہ پیسوں کے بدلے قتل ہے۔ یہ غیر یقینی اور ناگہانی صورتِ حال کسی جنگ کی صورتِ حال سے کسی طور پر کم نہیں ہے۔ فرد اس بے یقینی کی حالت میں گھر سے نکلتا ہے کہ وہ کسی بھی وجہ سے قتل کیا جا سکتا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ کسی وجہ سے ہی قتل کیا جائے۔ وہ بلاوجہ بھی کسی دہشت گردی کے واقعے میں ہلاک ہو سکتا ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جو فرد کی داخلی سطح میں شدید ہل چل پیدا کرتے ہیں اور فرد میں خوف اور دہشت جیسے اثرات اور کیفیات کو ہوا دیتے ہیں۔ انھی حالات کے زیرِ اثر لکھی گئی قرۃ العین شعیب (پ:۱۹۸۸ء) کی نظم " ایک دن مجھے مار دیا جائے گا " سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔۔یہ بھی ہو سکتا ہے/مجھے کہیں پھینک دیا جائے/ٹکڑے ٹکڑے کر کے بوری بند/
جسے ایدھی یا چھیپا والے/لاوارث کسی قبرستان میں دفنائیں گے/مجھے معلوم ہے مجھے مار
دیا جائے گا/کسی بھی طرح/گولی سے یا تیز دھار آلے سے/کسی بھی وجہ سے/یا بغیر کسی
وجہ کے/ایک دن مجھے مار دیا جائے گا!"(۱۳)

پاکستان میں آئے روز خود کش بم دھماکوں اور دہشت گردی کے واقعات نے یہاں بسنے والے افراد کی نفسیات کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ان واقعات میں مذہب، قوم، عمر، جنس اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہیں۔ ان واقعات کے ذمہ داران ناجانے کس کے ایجنڈے پر کارفرما ہیں کہ انھوں نے مسجد، گرجے، مندر اور گردوارے کا تقدس بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ اکثریت کے مطابق ان دہشت گردانہ کارروائیوں کے پیچھے دوسرے ممالک کے حساس اداروں کا ہاتھ ہے، جب کہ بعض کے خیال میں ان واقعات کے پیچھے مذہبی شدت پسندی کا عنصر کارفرما ہے۔ دہشت گردی کے انھی حالات کی ستم ظریفی کی روداد ایوب خاور(پ:۱۹۴۸ء)اپنی نظم" بہت کچھ کھو گیا ہے" میں یوں سناتے ہیں:

"بہت کچھ کھو گیا ہے۔۔۔/کیا بچا ہے ! ایک مقتل ! خامشی کے سرمئی جنگل کی طرح/
چپ میں ایک مقتل جس کے بیچوں بیچ اک بے نام لاش!/لاش کے چاروں طرف اک
گہری شام/شام بھی بدنام/خوں آشام/لاش کے کپڑوں کی ساری جیبیں خالی ہیں/ہوا
کے ہاتھ میں اب تک/کوئی ایسی نشانی بھی نہیں آئی/کہ وہ جس کی مدد سے میرے جیسی
اس بریدہ لاش کے وارث تک پہنچے/ازل زادو/بہت کچھ کھو گیا ہے۔۔۔/کرو ماتم!/کہ
میرا دل نکالا جا چکا ہے/روح چوری ہو گئی ہے/لاش باقی رہ گئی ہے/اے عزازادو!/کرو
ماتم/ہوا کے ساتھ مل کر/شام کی بے چاند/خوں آشام، کالک سے لدی دیوار سے لگ کر/
کرو ماتم"(۱۴)

شدت پسند نظریات کے حامل ان گروہوں نے نہ تو مذہبی اور مقدس مقامات کی حرمت کا پاس رکھا، نہ ہی انسانی اخلاقیات کا۔ دہشت گردی کے اسی واقعاتی تسلسل میں ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو ایسا الم ناک واقعہ رونما ہوا جس نے پورے ملک کو غم کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ ۱۶ دسمبر کے

دن سات دہشت گردوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں داخل ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس دہشت گردی کے نتیجے میں اسکول کے ایک سو چالیس معصوم طالب علم اور اساتذہ اپنی جان کی بازی ہار گئے اور متعدد طالب علم اور اساتذہ زخمی ہوئے۔ اس واقعے کو پاکستانی تاریخ کا الم ناک ترین واقعہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ نام نہاد مذہبی شدت پسندوں کے اس قبیح فعل نے انسانی اخلاقیات کو بری طرح پامال کیا۔ اس واقعے نے ان شدت پسند درندوں کی اخلاقیات کا پول کھول دیا جو خود کو نام نہاد مذہبی کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اس دل سوز واقعے نے جہاں پوری قوم کو افسردہ کیا وہیں بہت سے شعرا نے اپنی نظموں میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ اسی غم اور سوز کو بیان کرتی نوشی گیلانی (پ: ۱۹۶۴ء) کی نظم "سانحۂ پشاور پر..... نوحہ" ملاحظہ ہو:

"اے ہَواؤ سُنو!/ سَر جُھکائے ہوئے/ سِسکیاں مت بھرو/ تار کر دو رِدائیں/ لبادے
سبھی نوچ لو/ بَین کرتی رہو/ آج بیٹے مرے/ علم کی کھوج میں/ سُوئے مقتل چلے/ اِن کو
رخصت کرو/ آؤ ماتم کرو/ اے ہَواؤ سُنو!/ آؤ ماتم کرو!"(۱۵)

ملکی سطح پر ہونے والے ان دہشت گردی کے واقعات، جن میں کہیں بھی، کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت بھک سے بم پھٹ سکتا ہے، نے خوف و ہراس کی فضا کو جنم دیا ہے۔ ان خود سوز و خود کش بم دھماکوں میں، حملہ آور سمیت قرب و جوار میں موجود دیگر افراد کے جسم چیتھڑوں کی طرح اڑ جاتے ہیں اور لاشوں کی شناخت تک مٹ جاتی ہے۔ بعد میں ان بکھرے اعضا کو اکٹھا کر کے ان کی شناخت کو ممکن بنایا جاتا ہے۔ بم دھماکوں سے پیدا ہونے والی خوف و ہراس اور بے یقینی کی اسی صورت حال کو بیان کرتی حسین عابد کی نظم "سایے" ملاحظہ ہو:

"دیواروں سے خوف آتا ہے/ اوپر آن گریں گی/ دروازوں سے ڈر لگتا ہے/ کوئی توڑ کے
آن پھٹے گا/ باہر رہ زن قاتل بن کے پھرتا ہے/ یا قاتل نے روپ دھار لیا ہے رہ زن کا/
اپنی گلی ہی جنگل بن جائے تو/ ہر سایے سے ڈرنا پڑتا ہے"(۱۶)

دہشت گردی کے ان واقعات نے ملکی سطح پر خوف و دہشت کی جس فضا کو جنم دیا، اس کے اثرات فرد کے ہاں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لوگ ہجوموں، اجتماعی پروگراموں اور جگہوں (پارک،

سیر گاہ وغیرہ) میں جانے سے کتراتے ہیں۔ خوف کا یہی احساس اکیسویں صدی کی نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ خوف وہراس کی اسی فضا کی منظر کشی قاسم یعقوب (پ:۱۹۷۸ء) کی نظم '' شہر اپنا نوحہ پڑھتا ہے'' میں کچھ یوں کی گئی ہے:

''واقعہ بہت عرصے بعد المیہ بنتا ہے/ چوٹیں دیر بعد دکھ بنتی ہیں/ خون ہمارا قومی رنگ بن گیا ہے/ خوف کا چہرہ/ گرمیوں کے سورج کی طرح ہر گھر سے دیکھا جا سکتا ہے''(۱۷)

اس خوف وہراس کے ماحول میں رہنے والے عوام کی نفسیات میں تناؤ، کش مکش اور اضطراب کا عنصر واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں بہتی خون کی ندیاں معمول کا واقعہ بن چکی ہیں۔ اخباروں اور ٹی وی چینلوں پر آئے روز خون میں ڈوبی خبریں اور سطریں عصرِ حاضر کا نوحہ پڑھ رہی ہیں۔ خون پاکستان کا قومی رنگ بن چکا ہے اور خوف کے سایے ہر گھر کی منڈیر پر منڈلا رہے ہیں۔ ان حالات نے جہاں عام افراد کو ذہنی اور نفسیاتی سطح پر متاثر کیا وہیں اس دور کے ادیبوں اور شاعروں کی فکری و جذباتی سطح کو بھی بری طرح مجروح کیا ہے۔ نظم ''اجنبی سرد آسماں'' میں سلیم الرحمن (پ:۱۹۴۳ء) لکھتے ہیں:

''شانتی شانتی مانگنے والے شاعر کے اس شہر کا/ شور میری رگیں چیرتا ہے/ زمیں پھیلتے پھیلتے آسماں کو نگلنے لگی ہے/ برف زاروں سے گزری ہوا/ اب نسوں میں بھی چلنے لگی ہے/ شہرِ ہجراں میں خواہش بدن بن کے چلنے لگی ہے''(۱۸)

بہ طور حساس فرد شاعر ہمیشہ اپنے داخلی و خارجی (معروضی) حالات سے نسبتاً زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ اپنی اسی حساسیت اور جذباتیت کے باوصف وہ اپنے دور اور عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کی محسوسات اسے ان چیزوں کی حالت اور فردی احساسات کی خبر دیتی ہیں، جن سے بعض اوقات عام فرد بے خبر ہوتا ہے۔ اس کا یہ احساساتی جام، جامِ جم کے مقابلے میں اسے اپنے گرد و پیش اور معروضی حالات سے زیادہ باخبر بناتا ہے۔ وہ واقعات و حادثات اور مادی اشیا کی تفہیم اور مشاہدے کے ساتھ اپنے اور دیگر افراد پر ان کے اثرات اور غیر مادی وارداتوں مثلاً احساسات، جذبات اور کیفیات کا بھی علم رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے شاعروں کے ہاں گہرا اور مستند عصری شعور اور حالاتِ حاضرہ کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

دہشت گردی کے علاوہ پاکستان کو درپیش دوسرا بڑا مسئلہ شدت پسند خیالات اور نظریات کے حامل وہ طبقات ہیں جو ان نظریات کے بل بوتے پر، دیگر نظریات کے حامل افراد کا سر اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے یہاں بات کرتے ہوئے فرد کو ہزار دفعہ سوچنا پڑتا ہے۔ مکالمے کی روایت دم توڑتی جارہی ہے، جس کے سبب قوم نظریاتی و فکری سطح پر جمود کا شکار ہے۔ شدت پسند معاشروں میں بات کا ٹٹنے یا دلائل دینے کے بہ جائے زبان اور سر کاٹنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا معاشرے میں بھی یہی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں آوازیں حلق میں ہی دم توڑ جاتی ہیں اور اگر منہ سے نکل بھی جائیں تو ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی خیال کو آصف جمالی کی نظم ''آواز'' میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

''۔۔۔آوازیں مر جاتی ہیں/ شاید پہلے آوازیں مرتی نہ ہوں/ لیکن اب اکثر آوازیں منہ سے نکلتے ہی مر جاتی ہیں/ کچھ آدھے رستے میں/ کچھ منزل کے قریب/ کچھ ہونٹوں سے ہی مری ہوئی نکلتی ہیں/ میرے ارد گرد گدھ تاک میں ہیں/ ڈرتا ہوں کہیں/ میری آواز کی آنکھیں نہ نوچ لیں/ آواز کو کھلے آسمان تلے بھی نہیں چھوڑ سکتا/ آواز کی تدفین کہاں ہوتی ہے؟/ مجھے آواز کو دفن کرنا ہے''(۱۹)

دہشت گردی کے واقعات کی بڑی وجہ پاکستانی معاشرے میں پنپتی حتمیت پسند طرزِ فکر ہے۔ یہ حتمیت پسند طرزِ فکر گروہی حقائق اور مروّجہ اقدار و نظریات، تعصب کو جنم دیتی ہے اور اس تعصب کے حامل افراد کہنہ روایات اور نظریات پر پہرہ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر پاتے۔ جدید فلسفی تشکک پر ایمان رکھتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ کسی مخصوص ماحول میں درست نظر آنے والے حقائق کچھ اور حالات میں باطل بھی ہو سکتے ہیں۔ معلومات اور حقائق کی دریافت و بازیافت ایک مسلسل عمل ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ اور معروضی اور موجودہ حالات میں تبدل کی وجہ سے کل کو غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ تصویر کے مختلف رخوں پر حقیقت کے معیارات بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا جدید فلسفے کا عمومی رویہ کسی بھی ماورائی حقیقت اور خاص سچائی (Truth) کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ جب فرد کو اس بات کا

یقین ہو جاتا ہے کہ وہ حق کو تلاش کر چکا ہے تو اسے دوسرے بیمار ذہن اور مشکوک نظریات کے حامل اور پیروکار نظر آتے ہیں۔ یہ نظریاتی و صداقتی نرگسیت پسندی فرد میں شدت پسندی جیسے نظریات کو اجاگر کرتی ہے اور سماج کو اس خود ساختہ، مروّجہ و روایتی، نظریاتی اور صداقتی نرگسیت پسندی کے اثرات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ شدت پسندی کے سبب سماج میں پنپنے والے انھی مسائل کو عدنان محسن (پ:۱۹۸۵ء) کی نظم '' ہجوم ہٹ نہیں رہا'' میں مشال خان قتل کے واقعے کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے:

''سوال کا زبان سے جڑا ہوا جو تار ہے/وہ تار کٹ نہیں رہا/ ہجوم ہٹ نہیں رہا/وہ مر گیا۔۔۔/ ہجوم اُس کی ماں کی بد دعا سے ڈر نہیں رہا/ہجوم اسے چیختی پسلیوں کے بل گھسیٹتا چلا گیا/کسی نے اس کے زخم کو لعاب کا کفن دیا/کوئی بدن کو لاٹھیوں سے پیٹتا چلا گیا/قریب چند لوگ عکس بند کر رہے ہیں/کیمروں میں ایسے کھیل کو/کہ جس میں سب کھلاڑیوں کی آستیں پہ خون ہے/ہجوم کو جنون ہے۔۔۔ ہجوم ہٹ نہیں رہا/ میں منتظر ہوں اک طرف۔۔۔/مرے عقب میں چُپ کھڑی ہے اک محافظوں کی صف/ہجوم ہٹ نہیں رہا۔۔/ہجوم سے کہو ہٹے۔۔۔ غبار جانے کب چھٹے!/ میں اس کے درد سے بھنچے شکستہ ہاتھ کی گرفت سے/ذرا سی نظم کھینچ لوں/ محافظوں کا ترجماں۔۔۔ دعائے خیر میں مگن؟/نہیں نہیں! وہ پہلے سے رٹا بیان رٹ نہیں رہا/ مشال خان! خیر ہو!/تماشا گاہ سے تو رائگاں پلٹ نہیں رہا۔۔۔/ہجوم ہٹ نہیں رہا۔۔۔''(۲۰)

مشال خان کے قتل کا سانحہ ۱۳۔اپریل ۲۰۱۷ء کو پیش آیا۔ درج بالا نظم اسی واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ مشال خان کو مذہب کے خلاف بولنے اور گستاخانہ کلام کی پاداش میں ہاسٹل کے لڑکوں نے مل کر قتل کر دیا اور بعد میں وہ کسی ایسی بات کا ثبوت دینے میں ناکام رہے جس سے اس کی گستاخی ثابت ہو سکے کہ اس نے واقعی ایسے کلمات کہے ہیں۔ قاتل اور مقتول دونوں ایک سے مذہبی نظریات پر یقین رکھتے ہیں مگر شدت پسند نظریات کے حامل افراد نے اس پر الزام لگا کر اسے زدوکوب کا نشانہ بنایا اور سفاکی کے ساتھ قتل کر دیا۔ ایک مخصوص گروہ نے پورے مجمعے کے مذہبی نظریات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

انھیں اشتعال دلا کر اپنا مقصد پورا کر لیا اور اپنے خدا کے حضور اس فعل کو وسیلۂ نجات گردانا۔ انوار فطرت اپنی نظم ''ایک مہذب لاش کا قتل'' میں مذہبی شدت پسندی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۔۔۔ لیکن ذرا ٹھہریے!/ پہلی بات تو یہ ہے/ کہ مجھے خدا کے نام پر مت ماریے گا/ اس سے یہ تاثر ابھرے گا/ کہ ہم دونوں دو حاسد خداؤں کے بندے ہیں۔۔۔''(۲۱)

اسی خیال کو اپنی نظم ''خدا کو گالی مت دو'' میں ایک اور انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اے خدا پرست!/ مجھے گولی مارنے سے پہلے/ میرے لیے دعا بہ لب/ میری ماں کو مار آ/ ورنہ وہ جب تک جیتی رہی/ تیرے اور میرے خدا کی سماعت پر/ شک کرتی رہے گی''(۲۲)

ملکی سطح پر بڑھتی ہوئی اس شدت پسندی اور ان شدت پسند واقعات کے بہت سے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ ۳ دسمبر ۲۰۲۱ کو سیالکوٹ میں پیش آیا جس میں مقامی فیکٹری کے سری لنکا سے تعلق رکھنے والے مینجر پریانتھا کمارا کو مشتعل ہجوم نے توہینِ مذہب کے الزام میں قتل کر دیا۔ اس کی لاش کو بھی بعد میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ تشدد پسند نفسیات اور متشدد رویوں کی اور بھی بہت سی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جو معاشرے میں پنپتے شدت پسند رویوں کی دلالت کرتی ہیں۔ ان شدت پسند رویوں نے ملکی سطح پر افراد میں خوف و ہراس کو جنم دیا۔ اس واقعے سے نہ صرف بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی بل کہ اس نے پاکستانی معاشرے میں اقلیتوں کے حقوق اور ان کی بقا پر ایک سوال کھڑا کر دیا ہے۔ مکالمے کی فضا اور سوال کی روایت دم توڑ چکی ہے۔ خام اور نقصان دہ جذباتیت کو فروغ مل رہا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے مزید ہول ناک نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ پریانتھا کمارا کے قتل کے اس قابلِ مذمت واقعے سے متعلق معین نظامی اپنی نظم "سفیدی کا سرخ بوسہ" میں اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے سوہنی دھرتی کے اک شہر میں/ شہرِ اقبال میں/ کتنے آرام سے مار ڈالا گیا/ جیسے میں کوئی مچھر تھا/ جس کو ٹھکانے لگانے میں ہی عافیت تھی/ مجھے سینہ زوری کی جانب سے/ کچھ تہمتوں کی سلامی ملی/ کیسا بہتان دیدہ دلیری سے مجھ پر لگایا گیا تھا/ مجھے لگ رہا ہے/ کہ

بہتان بازوں کی ماں/تاقیامت یوں ہی سانپ جنتی رہے گی/محلّے کے سر کردہ افراد/اس کو کبھی بانجھ ہونے نہ دیں گے/ابھی سانس لیتا تھا میں/کہ مرے نعرہ زن میز بانوں نے/مجھ کو سڑک پر گھسیٹا/مجھے دن دہاڑے جلایا/میں ان کی نگاہوں میں کچرا تھا/یا ان کی فصلوں کا فضلہ تھا/جس کو جلانے کی عادت ہے ان کو/مرے جسم سے اٹھنے والے دھوئیں سے/نہ آنکھیں جلی تھیں/نہ سانسیں رکی تھیں/مری ادھ جلی نعش کو سب نے دیکھا/ مذاہب مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہے تھے/قوانین نظریں چراتے رہے تھے/کہیں سبز پرچم میں شامل سفیدی پہ/سرخی کا شب خون جاری تھا/مجھ کو مری ماں، سفیدی نے چوما"(۲۳)

پاکستان کو درپیش دہشت گردی کے ان مسائل کے پسِ پشت ان شدت پسند نظریات اور فرقہ وارانہ تعصبات کا گہرا عمل دخل ہے جنھوں نے پاکستانی معاشرے کو مختلف گروہوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا بھر میں مذہب کے سیاسی اور ذاتی مفاد کے استعمال کی روش جاری ہے۔ حکم ران اور مذہبی طبقہ ایسے نظریات کا پرچار کرتے ہیں جو لوگوں کو مخصوص پیمانوں میں ڈھال دے اور ان میں مخصوص قسم کے نرگسیت پسندانہ اور شدت پسندانہ رویوں کو جنم دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے گروہوں کو جنم دیتے ہیں ور ایک خدا کی بات کرتے ہوئے اس کی مخلوق کو مار دینے کی ذہن سازی کرتے ہیں۔ دیگر مذاہب کے بارے میں تعصب کو ابھارا جاتا ہے اور ہم مذہب لوگوں میں مختلف مسلکوں اور فرقوں کو جنم دیا جاتا ہے۔ اس تمام عمل کے پیچھے کار فرما سیاسی و ذاتی مفاد کے علاوہ دوسرا بڑا محرک جہالت ہے۔ ایک جاہل شخص جہالت بانٹتا ہے اور جہالت کا بول بالا ہوتا رہتا ہے۔ تقلید پرستانہ ماحول انھی مروّجہ نظریات کو لے کر آگے بڑھتا ہے جو کسی مخصوص شخص کو ذاتی فہم و ادراک کے مطابق درست لگتے ہیں۔ یوں سیاسی و نظریاتی سطح پر بھی لوگوں کو مروّجہ نظریات کا اہل بنایا جاتا ہے اور انھیں آپس میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ طاقت کے حصول کے لیے ملکی، قومی، خاندانی اور مذہبی عصبیت کو آلہ کار بنا کر اپنے مقاصد پورے کیے جاتے ہیں۔ تقسیم اور حکم مرانی (Divide and Rule) کا یہ کھیل چند لوگوں یا مخصوص طبقات کے مفادات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ نظریہ سازی کے ذریعے لوگوں کو یہ باور

کرادیا جاتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد فقط وہی ہے جس کی انھیں تعلیم دی جارہی ہے اور دنیا کی حقیقت وہی ہے جس پر وہ یقین کررہے ہیں۔اس یقین کو پختہ کرنے اور دوسرے عقائد و نظریات کے ماننے والوں کو نیچا اور باطل ثابت کرنے کے لیے ہر گروہ اپنی خود ساختہ اور خود پسند روایات اور دلائل وضع کرتا ہے۔ وہ اپنے تئیں اپنے گروہ کے اندر بیٹھا ہی دوسروں کو ان دلائل کے آگے پسپا ہوتے اور ہارتے ہوئے تصوّر کرتا ہے اور یوں ہر گروہ اپنی اپنی جگہ پر جہالت کا شکار ہوتے ہوئے نرگسیت کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔اس خود پسند اور نرگسیتی رویوں سے پیدا ہونے والی شدت پسندی سے ایک مخصوص طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے۔عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں لہٰذا نظریات اور خوف، دو ہی چیزوں کے بل بوتے پر حکم ران طبقہ ان پر حکومت کر سکتا ہے۔ پس طاقت کے حصول کے لیے لازم ہے کہ لوگ ان وضع کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں جنھیں ایک مخصوص طبقہ خاص مقاصد کے لیے وضع کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حقیقی طور پر ایک ہی نسل ''نسلِ انسانی'' سے تعلق رکھنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، زمین بانٹتے ہیں، سرحدیں کھینچتے ہیں اور ایک دوسرے کے سر کاٹتے ہیں۔ ارشد معراج(پ:۱۹۶۵ء) کی درج ذیل نظم ''ہزارہ قبیلے کا نوحہ'' مذہبی فرقہ بندی کی بنیاد پر، ہزارہ قبیلے میں ہونے والی قتل و غارت اور ان کے مصائب و آلام کو بیان کرتی ہوئی اسی امر کی طرف اشارہ کرتی ہے:

''تاج بابا علی/آ مصائب پڑھیں/آنکھ کو پھوڑ کر/خواب پر تھوک دیں/رات بھونڈی طوائف ہے/دن سالا بھڑوا چہکتا رہے/درد درماں نہیں/درد بڑھتا رہے/ہاتھ داڑھی پہ ہو/اور خصیے کھجاتے ہوئے/ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں/خون بہتا رہے/ جسم کے چیتھڑے/ایک گٹھڑی میں باندھے/تو سر بچ گئے/دھڑ سلامت رہیں/ سر تو اگ آئیں گے''(۲۴)

نظریات انسانوں کے تجربات، معلومات، علوم و فنون اور ارتقاے فکر کے وہ حاصلات ہیں جو انھیں زندگی گزارنے اور معاملات کو بہتر بنانے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ انسان اپنی نظریاتی سطح پر چیزوں کو پرکھتا ہے، سمجھتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ ارتقاے آدمیت نے یہ ثابت کیا ہے کہ نظریات بھی بنتے بگڑتے رہے ہیں اور ارتقائی عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ مگر اس عمل کے انتہائی چھوٹے وقفوں پر یہ

انسان کو جامد، معتبر اور مستند نظر آتے ہیں۔ وہ غور کرے تو یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اُس تک اِس حالت میں آنے سے پیشتر بھی یہ نظریات مختلف عوامل اور محرکات کے زیرِ اثر ارتقائی عمل سے گزرتے رہے ہیں۔ مگر اپنی عمر کے اس چھوٹے سے وقفے میں وہ ان کو مستند ترین اور بہترین تصوّر کرتا ہے اور بعض اوقات اس ارتقائی عمل سے گزرتے نظریات میں سے بعض پہلوؤں کو بہتر گردانتے ہوئے ان کو سنبھالے رکھتا ہے اور ان کی ترویج واشاعت کا اہتمام بھی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا جدید انسان بھی دورِ قدیم کے انسان کی طرح قتل وغارت کا حامی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے دور کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال، آج بھی ان جنگلی اور ابتدائی قبائلی نظام کی طرز پر اپنے معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ جاننا نہیں چاہتا کہ اس کے سچ کی حقیقت، اس کے قبائلی وملکی تفاخر اور اس کے نظریات وروایات کی بنیاد فقط اس کی خود پسندی اور جہالت پر ٹکی ہوئی ہے۔ خود کو ترقی یافتہ، مہذب اور عالم کہنے والے اس دور کے فرد کی نظریاتی اساس آج بھی دورِ جہالت کے پیمانوں پر ایستادہ ہے۔ آج بھی اس کے پاس قتل کرنے کے وہی جواز ہیں جو ابتدائی وحشی دور کے افراد کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ان مسائل نے پاکستانی معاشرے کو اس نہج پر لا کر کھڑا کیا ہے جہاں فرد اس معاشرے میں گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہاں کا مجموعی ماحول فرد کی آزادی کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور اسے ان مروّجہ اصولوں اور اخلاقیات کی نذر کر دیا جاتا ہے جو اس کے انتخاب کی طاقت کو سلب کر کے اسے وجودِ غیر مصدقہ (Inauthentic Being) کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ عوام کا مجموعی مزاج کسی تبدیلی کو قبول کرنے سے یک سر انکاری ہے اور وجود، جس کا خاصا ہے کہ وہ اپنا جوہر خود تخلیق کرتا ہے، وجود بہ ذاتِ خود (Being-in-itself) کی طرح معین شدہ جوہر کے نیچے دب چکا ہے، مگر اس کے احساسات اور جذبات ہنوز اسے ان پابندیوں سے آزاد ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ مجسمِ جبر بن کر رہ گیا ہے اور اس کے ہاں وجودی مسائل قنوطیت کے رنگ میں رنگنے لگے ہیں۔ ان پابندیوں کے علاوہ یہ نظریات، معاشرے میں شدت پسندی جیسے رویوں کو جنم دیتے ہیں جن کی بہ دولت سماج میں امن وامان کی صورتِ حال خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ ظالم اور مظلوم، قاتل اور مقتول کی اس روایت اور انسانی وحدت کو تباہ کرنے میں نظریات اور نظریات سازی کے عمل نے بنیادی کردار ادا کیا

ہے۔ شدت پسندی اور نظریات کی اس لڑائی کے نتیجے میں جنم لینے والی صورتِ حال کی تصویر ستیہ پال آنند (پ:۱۹۳۱ء) کی نظم ''زخم زخم ہے میرا چہرہ'' میں یوں پیش کی گئی ہے:

''زخم زخم ہے میرا چہرہ/خون پسینہ ایک ہوئے ہیں/یہ رومال جو خون سے تر میرے چہرے سے/لمحہ بھر کو چپک گیا ہے/قرنوں تک میرے چہرے کا خاکہ/اس کے خال و خد، رخسار، دہن، آنکھیں، پیشانی/میرے خوں کا ترش ذائقہ/اپنے تار و پود میں ایسے جذب کرے گا/میرے بعد بھی میرا چہرہ/اس رومال میں آنکھوں والے دیکھ سکیں گے!/کھوپڑیوں کے ڈھیر/گڑھوں میں بوری بند اعضا، تعفن میں لپٹے/ لپٹائے جیسے/خوابیدہ ہوں/نیند سے موت تلک کی دوری ایک قدم ہے/اس کا علم تو اس خود کش بمبار کو بھی شاید تھا/جس کی عمر لڑکپن کی دہلیز پہ کٹ کر ڈھیر ہوئی تھی/گھر، پانی کے نل، بسیں، کاریں، دیواریں/ مسجد اور منارے سارے/گولی تو گولی ہوتی ہے/بچوں، بوڑھوں، بہنوں، ماؤں۔۔۔سب کے سینے/ چھلنی کر کے/اپنی پیاس بجھا لیتی ہے/میں بھی شاید ان میں شامل اک بوڑھا ہوں/میرے سینے میں بھی گولی لگی ہوئی ہے/نام بدل جاتے ہیں لیکن/کیا تاریخ ہمیشہ خود کو دہرائے گی؟/کیا ہر دور میں میرا چہرہ/زخموں کے ان مٹ خاکوں کو/رومالوں میں جذب کرے گا؟''(۲۵)

''زخم زخم ہے میرا چہرہ'' کے عنوان سے لکھی گئی درج بالا نظم میں اس خوب صورت پیرائے میں عصری و معروضی حالات کی عکاسی کی گئی ہے کہ قاری کی نظروں کے سامنے ان تمام حالات کا منظر گھومنے لگتا ہے۔ اس نظم کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق مسیحی حکایات میں ملنے والے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مطابق مصلوب ہونے کے بعد ویرونکا نامی ایک خاتون نے اپنے رومال سے مصلوب عیسیٰ کے چہرے کا خون اور پسینہ پونچھا تھا اور اس عمل کے بعد اس رومال پر حضرت عیسیٰؑ کے خدوخال ابھر آئے تھے جنھیں برسوں بعد بھی لوگ دیکھ سکتے تھے۔

اکیسویں صدی کی اس زمانی حدود میں لکھی جانے نظموں میں دیگر عصری واقعات اور محرکات کے علاوہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو آنے والے زلزلے کی ہول ناک تباہی کے اثرات بھی کثرت سے دیکھنے کو

ملتے ہیں۔ ۸ اکتوبر کے اس زلزلے نے کشمیر اور افغانستان سمیت پاکستان کے علاقوں کو بھی بری طرح متاثر کیا، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد جاں بہ حق اور ہزاروں افراد زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ لاکھوں لوگوں کو ان متاثرہ علاقوں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ ان ہلاکتوں، ہجر مکانی اور زخمی ہونے والے افراد کی اس بڑی تعداد نے پاکستانی فضا کو مجموعی طور پر سوگوار بنائے رکھا۔ اسی سوگواری، دکھ و الم اور کرب کا احساس اس واقعے کے بعد لکھی جانے والی نظموں کا خاصا ہے۔ زلزلوں کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے انھی اثرات کی عکاسی شہزاد نیّر (پ: ۱۹۷۳ء) کی اس نظم "ملبے سے نئی دنیا نکلتی ہے" میں یوں دیکھنے کو ملتی ہے:

> "کہیں دھرتی نظر انداز ہوتی تھی/ گزرتے وقت کی بھاری چٹانیں/ تہہ بہ تہہ، سینے پر بچھتی تھیں/ کئی صدیوں کا دکھ اندر دباؤ کرتا رہتا تھا/ فشار نار سا دھرتی کے سینے میں پگھلتا تھا/ دبازت بڑھتی جاتی تھی!/ زمیں کے ضبط کی شدت چٹانوں سے ذرا پھسلی/ غضب سے کانپتی دھرتی لرز اٹھی/ توجہ چاہنے میں جان و تن بے حال کر ڈالے/ مکان ملبے میں ڈالے/ اور پتھر آنکھ میں ڈالے/ دراڑیں ہی دراڑیں تھیں/ میرے مالک! یہ کیا دنیا ہے/ جو میری کھنڈر دنیا کی جانب/ اک تسلسل سے بہاؤ کر رہی ہے" (۲۶)

زلزلے کے علاوہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں آنے والے سیلاب نے پاکستان کے بیشتر علاقوں کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں، مال مویشی اور گھر بار تیز سیلابی ریلے میں بہہ گئے۔ غربت کی چکی میں پستے کسان مزید بد حال ہو گئے۔ غذائی قلت کے ساتھ ساتھ طبّی سہولتوں کے فقدان سے پھیلنے والی وباؤں نے ان علاقوں کو گھیر لیا۔ جانی نقصان کے ساتھ بڑے پیمانے پر ہونے والے مالی نقصان نے لوگوں کو دکھ اور مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ نظامِ زندگی اور معمولات بری طرح متاثر ہوئے۔ گھریلو اشیا، ساز و سامان، فصلیں، مال مویشی اور گھر بار سب سیلاب کی نذر ہو گیا۔ بین الاقوامی سطح پر جاپان اور انڈونیشیا میں سونامیوں نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ "میرا خواب گھر—" کے عنوان سے حمیدہ شاہین (پ: ۱۹۶۳ء) سیلاب کی ان تباہ کاریوں کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

" المدد۔۔۔المدد!/کوئی سیلاب ہے/میرے گھر کو بہائے لیے جارہا ہے، کوئی سیلاب ہے/ناگنوں کی طرح شوکتی تند لہریں/ستونوں سے لپٹی ہوئی سبز بیلوں کے ٹکڑے اڑاتی /مری خواب گہ میں گھسی آرہی ہیں/گلابی مہکتا ہوا، نرم بستر/ہے ننھی سی ناؤ/جو بپھرے سمندر میں زیر و-زبر ہے/جسے یوں اٹھا کر پٹختی ہیں موجیں/کہ جیسے ابھی توڑ کر پھینک دیں گی/مرا خواب گھر۔۔۔"(۲۷)

سیلاب اور زلزلوں جیسی ان قدرتی آفات وبلیات کے علاوہ کرونا وبا کی حالیہ آفت نے فرد کی نفسیاتی سطح کو بری طرح متاثر کیا ہے۔اس موذی اور مہلک وبا نے بین الاقوامی سطح پر دنیا بھر کے ممالک کے سماجی و معاشی حالات پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ایک محدود دورانیے میں چین کے شہر ووہان سے پھوٹ کر اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔وبا کے سبب روز بہ روز بڑھتی ہوئی شرح اموات اور متاثرین کی شرح دنیا بھر میں خوف وہراس اور دہشت کا باعث بن رہی ہے۔کرونا وبا کے اس گزشتہ دورانیے نے فرد میں بے یقینی، وہم، خوف اور لایعنیت جیسی کیفیات کو جنم دیا ہے۔کرونائی وبا کے موضوعات کا احاطہ کرتی نظموں میں گہرا سماجی، سیاسی اور معاشی شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔ان نظموں میں قرنطینے کی تنہائی و مغائرت، اکتاہٹ اور بے زاری، بے یقینی، دہشت، کرب، سماجی فاصلے اور لاک ڈاون سے بڑھتی ہوئی باہمی دوریاں اور اکٹھ اور میلے کی دم توڑتی نفسیات، فرد و معاشرے کی زندگیوں پر معاشی گراوٹ کے اثرات، وبا کے جسمانی نقصانات اور موت کا خوف، صورت حال میں بہتری سے متعلق ناامیدی کا احساس اور اپنے اعزّہ واقارب کی موت پر غم اور تاسف کا اظہار جیسے موضوعات اور مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔سوشل میڈیا، ویب سائیٹس اور مطبوعہ شکل میں ان کرونائی موضوعات کا احاطہ کرتی نظموں کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔کرونا وبا کی اس صورت حال کی عکاسی جلیل عالی (پ:۱۹۴۵ء) کی نظم "ذرا سے کرونا نے" میں ان الفاظ میں دیکھنے کو ملتی ہے:

"ذرا سے وائرس نے/دوڑ لگوادی جہاں بھر کی/عزیزوں، دوستوں کے درمیاں بھی/ فاصلے دیوار کر ڈالے/دِنوں میں/شہر بن،/گھر غار کر ڈالے/جہازوں کو زمیں بستہ کیا ایسے/پرندے پر کٹے جیسے/ٹرینیں جام،/صبحیں شام کر ڈالیں/لگائے دفتروں، تعلیم گاہوں،/معبدوں پر خوف کے تالے/بھرے عشرت کدے، شاپنگ پلازے/کر دیے

ویران/اور سُنسان/سارے کوچہ و بازار کر ڈالے/دلوں پر دہشتوں کے/کیسے کاری وار کر ڈالے/ہر اک احساس پر دے پر/نمایاں موت کے آثار کر ڈالے/بدل ڈالے بیانی زاویے/سب فلسفے بیکار کر ڈالے۔"(۲۸)

عصری و معروضی حالات اور واقعات و سانحات جہاں ایک طرف افراد کی فکری و جذباتی سطح کو متاثر کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ادب میں نئے رجحانات کا باعث بنتے ہیں اور ادب میں نئے موضوعات در آتے ہیں۔ عالمی سطح پر اس اذیت ناک دورانیے میں تخلیق ہونے والے ادب پر کرونا وبا کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اردو نظم پر کرونائی اثرات کے لیے مطبوعہ کتب، خبارات، رسائل و جرائد اور ویب سائیٹس، سوشل میڈیا پر کرونائی موضوعات پر نظموں کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ۲۰۲۰ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے کرونا سے متعلق بہترین شعری تخلیقات پر "امید زیست" ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں انھیں سیکڑوں کی تعداد میں شعری تخلیقات موصول ہوئیں جس کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل تھا۔

اکیسویں صدی میں لکھی جانے والی نظموں میں گہرا عصری و معروضی اور واقعاتی شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس عہد میں لکھی جانے والی نظموں نے جہاں ایک طرف فرد کی جذبی و داخلی سطح کو قوتِ اظہار سے نوازا ہے وہیں دوسری طرف فرد کو درپیش معروضی و خارجی حالات اور مسائل، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، معاشی ہوں یا معاشرتی، کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اکیسویں صدی کی نظم نے اس پورے عہد کی تاثراتی، احساساتی اور واقعاتی تاریخ مرتب کی ہے۔ اکیسویں صدی کی اردو نظم کے دامن میں نائن الیون کے بہ طور مسلم ملک پاکستان اور دیگر مسلم ممالک پر اثرات، خانہ جنگی، دہشت گردی، خود کش دھماکے، زلزلے، سیلاب، شدت پسندی، معاشی گراوٹ اور کرونا وبا جیسے عصری و معروضی حالات و واقعات اور مسائل سے متعلق وسیع موضوعاتی اور متنوع سرمایہ موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) افتخار بیگ، ''وجودیت: انسانی رویوں اور ذات کے اثبات کا فلسفہ''، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۹، (فیصل آباد: اردو لٹریری بک سیریز، جون ۲۰۱۰ء)، ۲۹۹۔۳۰۰۔

(۲) دانیال طریر، ''اکیسویں صدی، مابعد جدیدیت اور کلامِ غالب کی معنویت''، مشمولہ: معنی فانی، (کوئٹہ: مہردر انسٹی ٹیوٹ)، ۲۵۔

(۳) مشاہدہ حسن، ''زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، (جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء)، ۳۱۰۔

(۴) ثمینہ تبسم، ''ڈونلڈ ٹرمپ سیٹڈروم آؤٹ بریک''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، (جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء)، ۲۲۹۔

(۵) وحید احمد، نظم نامہ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲)، ۸۶۔

(۶) سلمیٰ ریاض، ''عراق کی نذر''، مشمولہ: معاصر، جلد ۶، ۵، شمارہ ۹، ۸، ۷، (لاہور: ۶/۱۳ سی گلیمر ہائٹس وارث روڈ، جولائی ۲۰۰۵ء تا مارچ ۲۰۰۶ء)، ۵۷۴۔

(۷) معین نظامی، طلسمات، (لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۸ء)، ۹۷۔

(۸) ضیاء الحسن، آدھی بھوک اور پوری گالیاں، (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۷ء)، ۴۷۔

(۹) سعید الدین، ''مالِ غنیمت''، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۹، (فیصل آباد: اردو لٹریری بک سیریز، جون ۲۰۱۰ء)، ۳۲۱۔۳۲۲۔

(۱۰) نصیر احمد ناصر، ''دکھ گوتم سے بڑا ہے''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، (جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء)، ۲۸۰۔

(۱۱) حفیظ تبسم، ''گناہ گار شاعر کی بے گناہ نظمیں''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۲، (جہلم: بک کارنر، اگست ۲۰۱۷ء)، ۲۳۸۔

(۱۲) شاہد اشرف، ''چشمہ''، مشمولہ: نقاط، محولہ بالا، ۳۳۹۔۳۴۰۔

(۱۳) قراۃ العین فاطمہ، ''ایک دن مجھے بھی مار دیا جائے گا''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱، (جہلم: بک کارنر، اپریل ۲۰۱۷ء)، ۲۴۳۔

(۱۴) ایوب خاور، بہت کچھ کھو گیا ہے، (لاہور: جہانگیر بکس، ۲۰۰۹ء)، ۱۸۷۔

(15) http://urduashaarlatest.blogspot.com/2017/12/blog-post_533.html?m=1

(۱۶) حسین عابد، دھندلائے دن کی حدت،(لاہور: دستاویز، ۲۰۱۰ء)،۴۶۔

(۱۷) قاسم یعقوب، ریت پر بہتا پانی،(کراچی: آج پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)،۸۸۔

(۱۸) سلیم الرحمن، منظر جاگتا سوتا ہوا،(لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۷ء)،۱۳۲۔۱۳۳۔

(۱۹) آصف جمالی،''آواز''، مشمولہ:تسطیر، کتاب ۲،(جہلم: بک کارنر، اگست ۲۰۱۷ء)،۲۴۵۔

(۲۰) عدنان محسن،'' ہجوم ہٹ نہیں رہا''، مشمولہ: تسطیر، کتاب ۲،(جہلم: بک کارنر، اگست ۲۰۱۷ء)، ۲۰۷۔

(۲۱) انوار فطرت،''ایک مہذب لاش کا قتل''، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۱۱،(فیصل آباد: نقاط مطبوعات، دسمبر ۲۰۱۲ء)،۲۵۶۔

(۲۲) ایضاً۔

(23) https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=1981190155381572 &id =100004718193084

(۲۴) ارشد معراج،''ہزارہ قبیلے کا نوحہ''، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۱۳،(فیصل آباد: نقاط مطبوعات، مئی ۲۰۱۵ء)، ۱۲۵۔

(۲۵) ستیہ پال آنند،''زخم زخم ہے میرا چہرہ''، مشمولہ: نقاط، شمارہ نمبر ۱۲، (فیصل آباد: نقاط مطبوعات، جون ۲۰۱۴ء)، ۱۸۸۔۱۸۹۔

(۲۶) شہزاد نیئر،'' ملبے سے نئی دنیا نکلتی ہے''، مشمولہ: معاصر، محولہ بالا،۳۱۔

(۲۷) حمیدہ شاہین، زندہ ہوں،(لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۷

(28) http://pal.gov.pk/uza-57/

BIBLIOGRAPHY

- Ayub Khawar, *Bahut Kuch Kho Giya Hai*, (Lahore: Jahangir Books, 2009).
- Daniyal Tareer, *Jadīdiyat, Mā b'ad Jadidiyat Aur Ghalib*, (Quetta: Meherdar Institute of Research And Publication, 2013).
- Hamida Shaheen, *Zindā Huñ*, (Lahore: Multimedia Affairs, 2010).
- Hussain Abid, *Dhundlāe Din Ki Hiddat*, (Lahore: Dastavez Matbuat, 2010).
- Moeen Nizami, *Ṭilismāt*, (Lahore: Book Home, 2008).
- *Niqāt*, Number 9, 11, 12, 13, (Faisalabad: Niqat Matbuat).
- Qasim Yaqoob, *Rāit Pih Bihtā Pānī*, (Karachi: Aaj Publications, 2010).
- Richard Gill And Ernest Sherman. (Ed.) *The Fabric of Existentialism* (Philosophical And Literary Sources). (New Jersey: Pentice Hall Inc, 1973).
- Saleem-Ur-Rehman, *Manẓar Jāgtā Sotā Huā*, (Lahore: Multimedia Affairs, 2007).
- Tasṭīr, Book 1, 2, (Jhelum: Book Corner, 2017).
- Ziaul Hassan, *Ādhi Bhūk Aur Puri Gāliyañ*, (Lahore: Multimedia Affairs, 2007).

❖❖❖